KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

نثری اسباق کے خلاصے

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

(شبلی نعمانی)

خلاصہ: 145ھ تک علوم کا تعلق حافظہ سے تھا۔ سو برس کے بعد نحو نامہ، لغت، فقہ، اصول، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال اور طبقات کو رواج حاصل ہوا۔ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ اور منطق کے ساتھ کسی کی ہمدردی نہ تھی۔ تعلیم کے دوسرے دَور میں علوم و فنون کی ترویج بڑی تیزی سے ہوئی۔ اس دَور میں مرو، نیشا پور، ہرات، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام اور اندلس کے تمام چھوٹے بڑے شہر علمی صداؤں سے گونج رہے تھے۔ مگر حکومت اس سے بے تعلق تھی۔ کوئی سرکاری مدرسہ اور یونیورسٹی نہ تھی۔ علماء کے ذاتی مکانات اور خانقاہوں اور مسجدوں میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری تھا۔ ڈاکٹر سپرنگر نے تخمینہ لگایا ہے کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مسلمان عالموں کا حال درج ہے۔ علامہ ذہبی کے مطابق ایک استاد کے حلقۂ درس میں دس ہزار سے زائد شاگرد بیٹھے تھے۔ اور احادیث نبویؐ لکھتے تھے۔ املا یا لیکچر دینا اس دَور کا طریقہ تعلیم تھا۔ استاد لیکچر دیتا تھا اور تمام طلباء اپنے انداز اور تحریر میں لکھتے جاتے تھے۔ لوگ علم کے حصول کے لیے دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا اعلیٰ تعلیم کے لیے لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ بعض امراء اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں میں منعقد کیا کرتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ دینی تعلیم مذہب کا ضروری جز بن گئی تھی۔ عرب کے سوا جن دوسری قوموں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ بھی علوم و فنون میں عربوں سے پیچھے نہ تھے۔ یہی وجہ ہے نحو، لغت و حدیث، اصول فقہ اور فلسفہ کے امام اور پیشوا عام طور پر غیر عرب ہیں۔ وزراء، فوجی افسر اور اہل منصب بھی پڑھتے پڑھاتے تھے۔ کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ امراء اور اہل منصب شائقین علم کی سرپرستی کرتے تھے۔ علماء کو باقاعدہ تنخواہیں دی جاتی تھیں لیکن سلطنت عثمانیہ کے زمانے

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

میں ایک قانون بنایا گیا جس کے تحت مراکش میں سولہ برس اور تیونس میں پانچ برس ہر طالب علم کو درسگاہ میں رہنا لازمی تھا۔

تعلیم کے تیسرے دَور میں نحو، صرف، منطق اور امثال میں موشگافیاں شروع ہوئیں۔ جس کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا تھا۔ فنی تعلیم کے بجائے کتابی تعلیم کی بنیاد پڑی۔ جس کی وجہ سے اصل مسائل نظرانداز ہوئے اور تعلیم کی حالت ابتر ہوئی۔ ہلاکو خان نے بغداد کا کتب خانہ برباد کیا اور اسلامی ممالک کو کئی برسوں تک بے چراغ کیا۔

......☆..........☆......

سقراط

(مہدی افادی)

خلاصہ: سقراط یونان کا نامور حکیم تھا۔ وہ یونان کے شہر ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سنگتراش تھا۔ کچھ عرصے سقراط نے سنگتراشی کا کام بھی کیا لیکن فلسفے کے شوق نے اسے فلسفی بنادیا۔

ملکی قانون کے مطابق اس نے فوجی تربیت حاصل کی اور کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ جنگ میں دو نامور افراد ذنوفن اور ایلسی بائیڈیز کی جان بچائی۔ لڑائی سے فارغ ہونے کے بعد سقراط نے سادہ زندگی شروع کی۔ اس کی فلسفیانہ تحریریں بھی شائع ہوئیں۔ اس نے مذہب کی پابندی کی تاکید کی۔ سقراط اپنے شاگردوں کو حکمت و فلسفہ کے نازک مسئلے سمجھایا کرتا تھا اور آزاد رہنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔ اس کے ان نظریات کو حکومت حلقوں میں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور اس پر الزام لگایا کہ سقراط بچوں کے اخلاق خراب کررہا تھا اور اولاد کو والدین سے انحراف پر اُکساتا ہے۔ اُسے گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت سنایا گیا۔ دوستوں اور رشتہ داروں نے اس کی رہائی کے لیے بہت کوششیں کی۔ قید خانے سے فرار کے لیے جیل کے نگران کو بھی راضی کیا گیا لیکن سقراط نے جیل سے فرار کی سخت مخالفت کی اور کہا ''میں جیل سے بھاگنا نہیں چاہتا'' اس نے بخوشی زہر کا پیالہ پی لیا اور جان دے دی۔

اُس کی موت کے بعد تمام لوگوں کو سخت پشیمانی ہوئی۔ اس کی سوانح عمری اُن کے شاگردوں

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

افلاطون اور ذنوفن نے لکھی۔ سقراط کی بیوی بدمزاج تھی، جس سے وہ برداشت اور صبر کا عادی ہو گیا۔

سقراط کا نظریہ تھا کہ موجودہ وقت کو آنے والے دن کی امید پر ضائع کرنا سنگین غلطی ہے۔ وہ ذخیرہ اندوزی کو فضول کام سمجھتا تھا۔ کتب بینی کو عیش سے تعبیر کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہر وقت اور ہر عمر میں تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ وہ جاہل کو قابل رحم سمجھتا تھا۔ اُن کے خیال میں عالی ظرف شخص کی پہچان یہ ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ بھی بہتر اور معزز طریقے سے پیش آئے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے سچائی اور اصلیت کو پیش نظر رکھو۔ جن لوگوں کو کسی بات کی اصلیت کا یقین ہو اور اس پر کار بند نہیں ہوتے سقراط ان کو پتھر سے تشبیہ دیتے تھے۔

☆ ☆

فاقہ میں روزہ

(خواجہ حسن نظامی)

خلاصہ: دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے بھائی مرزا سلیم بہادر اپنے مصاحبین کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ حضور بیگم صاحبہ نے اسے زنان خانے بلا لیا۔ جب وہ زنان خانے سے باہر آئے تو مغموم اور پریشان لگ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ اماں حضور نے اسے رمضان میں گانے بجانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ پریشان تھے کہ رمضان کے باقی سولہ دن کیسے کٹیں گے؟ ایک مصاحب نے اسے مشورہ دیا کہ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد چلا کیجئے وہاں عجیب بہار ہوتی ہے۔ مرزا سلیم نے مصاحب کے کہنے پر عمل کیا اور باقاعدگی کے ساتھ مسجد جانے لگے۔

مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور کا بیان ہے کہ دہلی کی بربادی کے بعد ایک جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ جگہ جگہ چولھے بنے ہوئے تھے۔ سپاہی روٹیاں پکا رہے تھے۔ گھوڑوں کے گھاس کا انبار لگا تھا۔ مسجد اصطبل کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ افطاری کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ صرف چند غریب لوگ مسجد میں موجود تھے۔ میں نے مرزا شہ زور غدر کا قصہ اور تباہی کا افسانہ سننا چاہا۔ اصرار کے بعد وہ گویا ہوئے۔

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

جب انگریزوں نے دہلی کے شاہی قلعے پر قبضہ کیا اور بادشاہ قلعہ چھوڑ کر نکل گئے تو میں بھی اپنی بوڑھی ماں، بیمار بیوی اور دس برس کی معصوم بہن کے ہمراہ بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم نے گرتے پڑتے ایک طویل مسافت طے کی اور مسلمان میراثیوں کے ایک گاؤں میں دم لیا۔ ان سادہ دل لوگوں نے ہمیں کئی دن تک اپنی جھونپڑیوں میں ٹھہرایا اور کھانا کھانے کو دیا۔ لیکن وہ غریب لوگ تھے ایک پورے خاندان کا بار نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے گاؤں کے کھیتوں کی رکھوالی شروع کی۔ جس کے عوض وہ مزدوری دیتے تھے۔ گاؤں کے چودھری بھی میری مدد کرتا رہتا تھا۔ لیکن ایک ان پانی کا ایسا سیلاب آ کر پورے گاؤں کو تاراج کر دیا۔ پانی گھروں میں موجود غلہ بھی بہا لے گیا۔ گاؤں پر قحط کے بادل منڈلانے لگے۔ میری بیوی کو بخار ہو گیا اور دوسرے دن اس نے جان دے دی۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گاؤں کے چودھری نے آٹا بھیج دیا۔ آٹا کا نصف ابھی خرچ ہوا تھا کہ رمضان کا چاند نظر آیا۔ رمضان کا چاند دیکھتے ہی میری ماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ میں سمجھ گیا کہ اسے اگلا وقت یاد آ گیا ہے۔ چار پانچ دن بعد آٹا ختم ہو گیا۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا۔ بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ ہم بھوکے گھر میں بیٹھے تھے۔ والدہ خاموش تھی، میں چھوٹی بہن کو دلاسہ دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم بھوکے سو گئے۔ سحری کے وقت بیدار ہوئے تو تہجد کے نماز میں والدہ نے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی۔ یا اللہ! ہم نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ ہم جو رمضان میں سینکڑوں لوگوں کو کھلاتے تھے خود دانے دانے کے محتاج ہیں؟ دوسرا دن بھی گزر گیا اور فاقہ میں روزہ پر روزہ رکھا۔ شام کو چودھری کچھ کھانا اور پانچ روپے زکوٰۃ کے دے گیا۔ ماں یہ سن کر آگ بگولہ ہو گئی کہ میں زکوٰۃ کیوں لایا۔ اس کے کھانے سے مر جانا بہتر ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد معلوم نہیں اس نے کیا سوچا کہ مجھے ان روپوں سے سامان خریدنے کی اجازت دے دی۔ جس سے رمضان بخیریت گزر گیا۔ چھ مہینے بعد دہلی واپس آئے۔ یہاں والدہ فوت ہو گئیں۔ بہن کی شادی کر دی۔ اب دہلی میں پڑا ہوں اور انگریز سرکار کے پانچ روپے ماہوار پنشن پر گزارہ کر رہا ہوں۔

☆ ☆

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

پھر وطنیت کی طرف

(مولانا صلاح الدین احمد)

خلاصہ: قیام پاکستان سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ملی وحدت کا جذبہ موجود تھا۔ جس کی وجہ سے وطنیت کا تصور مسلمانوں کے ذہن سے مٹ گیا تھا لیکن یہ ایک معمہ ہے کہ پھر کیوں مسلمانانِ ہند نے ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے لئے ایک خود مختار اور آزاد وطن کا مطالبہ کیا۔ جس ہستی نے ہمیں پاکستان کا تصور دیا وہ خود بھی وطن روز وطنیت کے یکسر مخالف تھے۔ لیکن مفکر پاکستان علامہ اقبال نے جب جذبات سے انکار کی طرف انحراف کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامیان ہند کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ ہندوستان کے شمال مغربی کونے میں اپنے لئے ایک الگ مملکت کی تشکیل اور تاسیس کریں۔ پاکستان کا تصور اقبال کے آفاق گیر نظریے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ بلاشبہ اس نے رجعت سے کام لیا لیکن اُن کی یہ رجعت حقیقت پسندانہ تھی کیونکہ مسلمانوں کو اپنے اور مذہب کی تحفظ کے لئے کسی بحرِ بے پایاں اور آسمان بیکراں کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں ایک ایسے خطۂ زمین کی ضرورت تھی جس میں رہ کر وہ آزادی کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

مسلمانوں کی یہ ضرورت پاکستان بننے کے بعد کسی حد تک پوری ہوئی۔ اب ہر مسلمان کا فرض بنتا ہے کہ اس ملک کی بقا اور سالمیت کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ ہم سب پر لازم ہے کہ اس کی تحفظ اور اس کے فروغ کو تمام دیگر فرائض پر ترجیح دیں۔ یہ ملک سلامت رہے گا تو خدمت دین اور تعمیر ملت کے موقع بھی ادا کر سکیں گے۔ آزادی کے بعد وطن اور ملت کا مفاد ایک ہو گیا ہے۔ ایک کا فروغ دوسرے کی ترقی کا ضامن ہے۔ ہم سب کے سامنے ایک مشترکہ نصب العین ہو۔ یہ نصب العین وطن دوستی اور وطن پروری کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس نصب العین پر کاربند رہ کر آگے بڑھیں تو ملک کی فلاح و بہبود اور ترقی میں حصہ لے سکتے ہیں اور ہماری وطن دوستی ہمارے ملی روابط پر غالب نہیں آئے گی۔

......☆............☆......

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار

(محمد حسین آزاد)

خلاصہ: میں دنیا کے نامور اور مشہور لوگوں کے متعلق غور کر رہا تھا کہ میری آنکھ لگ گئی۔خواب میں دیکھا کہ ایک وسیع وعریض میدان ہے اور لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ایک پہاڑ کی چوٹی سے موسیقی کی آوازیں آ رہی ہیں۔اور لوگ اس پہاڑ کی طرف کھینچے چلے جا رہے ہیں۔کچھ لوگ حسین اور خوبصورت عورتوں کے حسن کا تماشا کر رہے ہیں۔جو لوگ پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے۔اُن میں ہر علم اور پیشے کے لوگ موجود تھے۔ایک فرشتے کی ہدایت پر میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر دیکھا کہ ایک پری حور شمائل کرسی پر بیٹھی ہے۔شہنائی بج رہی ہے اور لوگ اس کے دربار میں داخل ہونے اور ملاقات کرنے کے لیے بے چین ہیں۔یکا یک راجہ بکرما جیت ہوا کے تخت پر سوار تیس پریوں کے ہمراہ دربار میں داخل ہوا اور اُنہیں مسند پر بٹھا دیا گیا۔راجہ بھوج کے آنے پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا۔اس راجہ کے عہد میں کالی داس شاعر نے سنگھاسن بتیسی نامی کتاب تحریر کی تھی۔چنانچہ اسے بھی دربار میں جگہ دی گئی۔

دوسرے دروازے سے ایرانی بادشاہ اور پہلوان داخل ہو رہے تھے۔"شاہنامہ اسلام" کا مصنف "فردوسی" بھی اسی دروازے سے داخل ہوا۔ایک یونانی مورخ اور فاتح اعظم سکندر بھی دربار میں آ کر مسند پر بیٹھ گئے۔سقراط اپنے شاگردوں افلاطون اور جالینوس کیساتھ دربار میں داخل ہوئے۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید کو بھی داخلے کی اجازت مل گئی۔محمود اپنے غلام آیاز کے ساتھ داخل ہو کر رونق افروز ہوئے۔بوعلی سینا کے آنے پر کچھ لوگ اعتراض کرنے لگے۔لیکن اس نے کسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے زبردستی گھس کر ارسطو کے مقابل ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ایرانی اور تورانی شعراء اور مصوروں کا ایک جلوس اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔لیکن ان میں صرف انوری، خاقانی، ظہیر غاریابی وغیرہ کو اجازت مل گئی۔باقی سب نکالے گئے۔اس کے بعد پہلے چنگیز خان اور پھر ہلاکو خان آئے۔جن کے آنے پر کچھ لوگوں نے ہنگامہ کیا۔نصیر الدین طوسی کی سفارش پر ہلاکو خان کو دربار میں جگہ مل گئی۔جبکہ چنگیز خان کے کاغذات پر خون کے چھینٹے دیکر اور ایک سیاہی کا داغ لگا کر بٹھا دیا گیا۔امیر تیمور کسی سے

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

پوچھے بغیر لنگڑاتا اور راستہ صاف کرتا ہوا آگے بڑھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حافظ شیرازی آئے اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا کر واپس چلے گئے۔ شیخ سعدی بھی اپنے ساتھی لڑکوں کے ایک غول کے ساتھ آئے اور نکل گئے۔ اس کے بعد افغان بادشاہ شیر شاہ سوری جلال الدین محمد اکبر، نور الدین جہانگیر اس کی معشوقہ نور جہاں اور شاہ جہان داخل ہوئے۔ شاہ جہان کا بھائی اندھا شہریار بھی اپنے بچوں کے ساتھ داخل ہوا اور لوگ شاہ جہان کے آنے پر معترض ہوئے۔ لیکن کچھ قیل وقال کے بعد اس کو جگہ مل گئی۔ ان کے بعد دو اور بادشاہ محمد شاہ اور نادر شاہ کو بھی داخلے کی اجازت مل گئی۔ اس دربار میں کچھ ہندوستانی شعراء بھی رونق افروز ہوئے۔ ان میں مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر حسن، میر انشاء اللہ خان اور جرأت رشامل تھے۔ ادیبوں میں میر امن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور تھے۔ ذوق کے آنے پر سودا نے ملک الشعرائی کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ آخر میں مرزا غالب آئے لیکن بڑی شان سے آئے۔ اس کے آنے پر بڑی واہ واہ ہوئی۔ اب صرف ایک کرسی خالی تھی۔ کسی نے آواز دی کہ محمد حسین آزاد کو بلاؤ اور اس کرسی پر بٹھا دو۔ کچھ افراد نے شور مچایا کہ آزاد اس کرسی پر بیٹھنے کے قابل نہیں۔ بحث و تکرار شروع ہوئی، میں نے چاہا کہ نقاب منہ سے ہٹا کر آگے بڑھوں اور اپنی صفائی میں کچھ کہوں لیکن فرشتہ رحمت نے مجھے ایسا کرنے سے روکا۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی، کم از کم مردوں سے زندوں میں تو آ گیا۔

......☆............☆......

چند روز ایک روڈ رولر کے ساتھ

(وزیر آغا)

خلاصہ: چند روز پہلے ہمارے گاؤں کی کچی سڑک کو پختہ کرنے کے لیے ایک روڈ رولر آیا۔ بچے اسے دیکھ کر شور مچانے لگے۔ عام لوگ بھی بڑی حیرت سے اُسے دیکھنے لگے لیکن چند دن بعد لوگوں کی حیرت ماند پڑ گئی۔ اب جب رولر کا ڈرائیور کام بند کر کے واپس چلا جاتا ہے تو میں روڈ رولر کے پاس آ کر اس عجوبۂ روزگار کو دیکھتا رہتا ہوں جو بہت پرانا ہو چکا ہے۔ ایک دن میں نے ڈرائیور سے روڈ رولر پر بیٹھنے

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بخوشی تیار ہو گیا اور میں دوسرے روز روڈ رولر پر ڈرائیور کے ساتھ سوار ہو گیا۔ جب ایک جھٹکے سے روڈ رولر چل پڑا تو تادیر میں یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ رول کھڑا ہے یا چل رہا ہے۔ میں نے رولر کی رفتار کا اندازہ لگانے کے لیے ایک نظر نہر کے پانی پر ڈالی جس میں پرندے کا پر بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہ روڈ رولر کے پاس سے گزرا اور گزرتا ہی چلا گیا۔ مجھے شک ہوا کہ رولر ابھی چلا ہی نہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ چل رہا تھا۔ ایک زاویے سے دیکھیں تو چل رہا تھا، دوسرے سے ٹھہرا ہوا لگتا تھا۔ ایک گھنٹے میں پچاس گز کا فاصلہ طے ہوا۔ چلتے چلتے رولر ایک درخت کے نیچے آ گیا اور درخت کے سائے سے نکلنے میں پندرہ منٹ لگا دیئے۔ اس دوران میں نے درخت کی شاخوں کا بغور جائزہ لیا۔ ایک بل بتوڑی اپنے بچوں کے ساتھ ایک شاخ پر بیٹھی نظر آئی جس نے روڈ رولر کا کوئی اثر نہیں لیا۔ کوئی اور سواری ہوتی تو تمام پرندے خوفزدہ ہو کر اُڑ جاتے۔ میں نے ریل اور کار میں بھی سفر کیا ہے۔ اس میں سفر کے دوران باہر نظر آنے والی تمام اشیاء متحرک نظر آتی ہیں۔ کسی شے پر نظر نہیں جمتی لیکن روڈ رولر پر بیٹھتے ہی ایک بُعد کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو جگاتا تو ہے لیکن ہڑ بڑا کر اُٹھ بھاگنے پر مائل نہیں کرتا۔ روڈ رولر پر بیٹھتے ہی یوں لگتا ہے جیسے یہ درخت، پہاڑیاں، نہر، پرندے اور کھیت نہ جانے کب سے رُکے کھڑے تھے۔ یکا یک اپنے ہونے اور موجودگی کا علان کرنے لگے ہیں۔ آج مجھے یوں لگا کہ موجودگی، ہست کے رُکے ہوئے بے جان وجود کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک مہین غلاف ہے اور پوری طرح گندھی ہوئی ایک بھرپور شے ہے۔ مجھے روڈ رولرر پر سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اب میں اُترنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے رولر پر گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن میں نے کہا کہ میں جلد گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔ رولر سے اُترا تو میں ایک اور شخص تھا۔ میرے لئے روڈ رولر ہست کا ایک انگ نہیں تھا بلکہ ایک خودمختار، سدابہار، دھڑکتی اور سانس لیتی ہوئی موجودگی کا مظہر تھا۔

......☆............☆......

منظور

(سعادت حسن منٹو)

خلاصہ: اختر ابھی چھوٹے تھے کہ اس کے والدین وفات ہو گئے تھے۔ اب اس کی عمر تیئس سال تھی۔

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

اسے دل کا عارضہ لاحق تھا۔ اسے ایک دن دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال میں بے ہوشی کی حالت میں داخل کیے گئے۔ وہ سارا دن بے ہوش رہے۔ اسے آکسیجن پر رکھا گیا تھا۔ وہ ہسپتال کے بڑے وارڈ میں پڑا تھا۔ شام تک اسے چار ٹیکے لگائے جا چکے تھے۔ اب وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ اس کی آکسیجن ہٹائی گئی۔ جب اختر نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو اس کے داہنے ہاتھ پر نو دس برس کا لڑکا کمبل میں لپٹا پڑا تھا۔ اختر کو اپنی طرف دیکھ کر لڑکے نے سلام کیا اور اختر کی طبیعت دریافت کی۔ اس نے اختر کو تسلی دی اور کہا کہ آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ لڑکے نے اپنا نام منظور بتایا۔

منظور ہسپتال کے تمام مریضوں، نرسوں اور ڈاکٹروں سے مانوس تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ہنس ہنس کر بولتا تھا۔ وارڈ کے ہر مریض سے اس کی دلچسپی تھی۔ ہر ایک کی حالت پوچھتا۔ کوئی اس کا ماموں، کوئی چچا، کوئی بھائی جان اور کوئی اس کا دوست تھا۔ منظور میں غیر معمولی کشش تھی۔ سب اس کو پیار کرتے تھے۔ ہر وقت خوش رہتا تھا اور باتیں زیادہ کرتا تھا۔ اس کا باپ درزی تھا۔ دوپہر کو پندرہ بیس منٹ کے لئے آتا اور چلا جاتا۔ اختر دل کا مریض تھا اور زیادہ باتوں سے اس میں چڑچڑاپن زیادہ ہونے کا امکان تھا۔ لیکن منظور کی باتیں اسے اچھی لگتی تھیں۔ اختر کا خیال تھا کہ اسے جو افاقہ ہوا ہے یہ منظور کی باتوں کی بدولت ہے۔ منظور کا مرض بہت مہلک تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دیا تھا۔ وہ چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ اس کا نچلا دھڑ مفلوج تھا۔ اسے فالج ہو گیا تھا۔ منظور نے سدا خوش رہنے کا گر اپنی طویل علالت سے سیکھا تھا۔ وہ خود خوش رہتا اور وارڈ کے دوسرے مریضوں کو خوش رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ ہسپتال میں ایک مہینے کے دوران اختر پر تین دل کے دورے پڑے تھے۔ لیکن اب اس کی حالت اچھی تھی اور خطرے سے باہر تھا۔ اختر کو معلوم تھا کہ اسے بچانے والا کوئی ڈاکٹر یا انجکشن یا دوائی نہیں بلکہ صرف منظور کی ذات ہے۔ ایک دن ڈاکٹروں نے منظور کے باپ سے کہا کہ منظور کو گھر لے جائے۔ یہ سن کر منظور کو دلی صدمہ ہوا۔ وہ ہسپتال نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ گھر میں ایسا کوئی نہ تھا جن کے ساتھ منظور باتیں کرتا اور وقت گزارتا۔ اختر بھی اس کی جدائی سے پریشان تھا۔ منظور نے اسے نئی زندگی عطا کی تھی۔ وہ اس کا محسن تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اختر سو گیا۔ صبح دیر سے اُٹھا، منظور کی چارپائی کی طرف دیکھا تو وہ موجود نہیں تھا۔ اس نے چلا کر ایک نرس سے پوچھا منظور کہاں ہے؟ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد نرس

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

نے گلوگیر آواز میں کہا" بے چارہ! صبح پانچ بجے مر گیا۔" یہ سن کر اختر نے اپنا دل پکڑ لیا۔

......☆............☆......

ایک شجرۂ نسب

(غلام عباس)

خلاصہ: اس شجرۂ نسب کے جدامجد چھجو صاحب کبابی کی دُکان کرتے تھے۔ چھجو کا بیٹا سیتا پان سگریٹ اور عطاری کا دُکان کرنے لگے۔ شیخ سیتا کے بیٹے ان پڑھ تھے لیکن عقلمند تھے۔ حکمت کا کام کرتے تھے۔ اس کا نام عمر دراز تھا۔ عمر دراز کا بیٹا چودھری شمس الدین ٹھیکیداری کرتے تھے اور خاصی دولت کمائی۔ چودھری شمس الدین کے بیٹے شفاعت احمد نے بارھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ کلرک بھرتی ہوئے، سپرنٹنڈنٹ ریٹائر ہوئے۔ حاجی شفاعت احمد کے بیٹے قاری غوث محمد ریلوے میں گارڈ تھے۔ صوم وصلاۃ کے پابند تھے۔ قاری غوث محمد کے فرزند خان صاحب غضنفر علی شان نے بی۔ اے کیا اور پولیس انسپکٹر بنے۔ شراب پیتے تھے اور بدمزاج تھے۔ تھانیداری سے آگے نہ بڑھے۔ غضنفر علی شان کا بیٹا شیخ تراب علی چشتی بی۔ اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ خوش طبع اور رہنس مکھ تھے۔ شیخ تراب علی چشتی کا بیٹا ڈاکٹر تحسین علی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس فزیشن اینڈ سرجن بنے۔ لیکن ڈاکٹر تحسین علی کے بیٹے مسٹر الیاس ہارون بار ریٹ لاء نے وکالت کی ڈگری حاصل کی اور برطانیہ سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ خان بہادر میاں رکن الدین جو الیاس ہارون کا بیٹا تھا سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور کوشش کرتے کرتے مجلس قانون ساز کے ممبر بن گئے۔ اس کے خاندان کو سرکاری خطابات بھی ملے۔ اس کا بیٹا آنریبل سردار شکوہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بن گئے۔ چیف جسٹس سردار شکوہ کے بیٹے نے خاندان کا نام روشن کیا اور پی۔ ایس، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ ای گورنر بنے۔ اس کا نام سر جمشید بہادر تھا۔ سر جمشید بہادر کا بیٹا خان بہادر صوفی بیدار بخت ایک نامی گرامی جاگیردار تھے۔ صوفی بیدار بخت کے بیٹے صاحبزادہ نسیم نے بھی زمینوں کی دیکھ بھال میں اپنی عمر بسر کی۔ اس کا بیٹا ابوالخیال مرزا ابکیل شاعر تھے۔ مرزا ابکیل کا بیٹا ننھے مرزا کو فن موسیقی سے لگاؤ تھا۔ موسیقی کے بارے میں کتاب بھی لکھی۔ ننھے مرزا کا بیٹا لاڈلے مرزا ایک

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

فلمی اداکارہ کے عاشق ہو گئے۔اس پر بہت سی دولت لٹا دی۔آخرکار دونوں کی شادی ہو گئی۔لیکن شادی کے دوسرے برس کسی ایکٹر کے ساتھ بھاگ گئی۔آخری عمر میں اُن چند مکانات اور دکانوں پر گزارہ کرنے لگے جو باقی رہ گئی تھیں۔اداکارہ لیلیٰ کے بطن سے اس کا ایک بیٹا محمد شفیع پیدا ہوئے تھے۔جس نے باپ کے مرنے کے بعد اسٹیشن کے قریب ہوٹل کھول لیا اور چوری چھپے شراب بھی بیچنی شروع کر دی۔

......☆............☆......

مائیں

(احمد ندیم قاسمی)

خلاصہ: خواجہ صاحب اور راجہ صاحب کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ایک دیوار میں کیل گاڑی جاتی تو دوسرے کا پلستر اُکھڑ جاتا۔ان دونوں کی بیگمات ہر روز کسی نہ کسی بات پر لڑتی جھگڑتی تھیں۔ایک دن زلزلہ آیا۔بیگم راجہ سمجھیں کہ بیگم خواجہ نے اپنے کمرے میں پلنگ گھسیٹا ہے۔کھڑکی میں منہ ڈال کر بیگم خواجہ کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔لیکن خود راجہ صاحب اور خواجہ صاحب بیگمات کے جھگڑوں سے بے نیاز ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔اکٹھے سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔اُن کی موجودگی میں بھی بیگمات بڑے زور و شور سے لڑتیں۔اُن کی یہ لڑائیاں معمول بن چکی تھیں۔ایک بار محلے کے ایک بزرگ نے دونوں کو روک کر کہا کہ اپنے بیویوں کو روکئے۔پورا محلہ بدنام ہو رہا ہے لیکن راجہ صاحب نے نہایت قناعت سے جواب دیا "یہ عورتوں کا معاملہ ہے اس میں دخل دینا مناسب نہیں۔اگر آپ اپنی بیگم کو بھیج کر ان کو سمجھا دیں تو اور بات ہے۔" بیگم راجہ اور بیگم خواجہ کی تکرار اور لڑائی میں الزام تراشی بہت کم ہوتی تھیں اور بددعائیں زیادہ ہوتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ محلے والوں کو لڑائی میں اتنا لطف نہیں آتا تھا۔عموماً جھگڑے کا آغاز بیگم راجہ کی طرف سے ہوتا تھا۔لیکن آج بیگم خواجہ نے پہل کی اور بولیں کہ تمہارے لڑکے نے میرے لال کے ران میں پنسل ماری ہے۔جس سے چمڑہ اُتر گیا ہے اور تکلیف میں ہے۔اس کے بدلے میں تمہارے بیٹے کے پیٹ میں چاقو ماروں گی۔یہ سن کر بیگم راجہ بگڑ گئیں اور کہا میں تیرا کلیجہ چباؤں گی۔بیگم خواجہ نے اپنے زخمی بچے کو کھڑکی میں بٹھا دیا اور ران پر سے پاجامہ ہٹایا۔بیگم راجہ نے

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

کھڑکی کے پاس آ کر دیکھا تو دم بخود رہ گئیں۔ بچے کے ران پر خون رس کی جم گیا تھا۔اس نے بچے کو گود میں اُٹھالیا اور اسے منانے لگی۔اتنے میں بیگم راجہ کا بیٹا آ گیا دیکھتے ہی اپنے بیٹے پر جھپٹیں اور دو چار تھپڑ رسید کیے۔پھر لکڑی اُٹھا کر مارنے لگی۔ بچے کی چیخیں پورے محلے میں سنائی دینے لگیں۔بیگم خواجہ یہ دیکھ کر دوڑیں اور بچے کو بیگم راجہ سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔لیکن وہ کسی طرح بچے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔وہ برابر کہے جا رہی تھی میں اسے سزا ضرور دوں گی۔بیگم خواجہ نے بہتیرا سمجھایا کہ ذرا سی پنسل ہی تو لگی ہے کونسا غضب ہو گیا ہے جو اپنے بچے کی جان کے پیچھے پڑ گئی ہو۔لیکن بیگم راجہ نے بیگم خواجہ کے بچے کے ران سے پاجامہ ہٹاتے ہوئے کہا ''یہ ذرا سی پنسل ہے، اس کی تو کھال ادھڑی ہوئی ہے۔اس نے بچے کو سینے سے چمٹالیا۔دوسری طرف بیگم خواجہ نے بیگم راجہ کے بچے کو گود سے لگا رکھا تھا اور اپنی ماں سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔یکایک دونوں کو احساس ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے بچوں کو سینے سے چمٹائے رو رہی ہیں۔یہ صورتحال دیکھ کر دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگیں۔پھر بیگم خواجہ نے ہنسی روک کر بولیں ہم بھی کتنی پاگل ہیں۔

☆ ☆

سیاہ فام

(شوکت صدیقی)

خلاصہ: درانی صاحب کی کار نے عبداللہ کو ٹکر مار کر زخمی کر دیا تھا ہسپتال میں اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے معذور ہو گیا اب وہ کمائی کے قابل نہیں رہا تھا اور بیوی بچوں کی کفالت سے قاصر تھا لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے محلے میں ایک عورت سکینہ نام کی تھی جس کا بیٹا کسی بات پر ناراض ہو کر کہیں چلا گیا تھا اور کئی سال سے اس کے متعلق کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے سکینہ بیگم ہر شام کرار ہر کی کھچڑی پکاتی اور اپنے بیٹے کا انتظار کرتی کہ وہ آج شام کو گھر آ جائے گا لیکن اس نے نہ آنا تھا نہ آیا۔رات دیر گئے جب وہ مایوس ہو جاتی تو پکا ہوا کھانا اڑوس پڑوس میں تقسیم کرتی عبداللہ کے گھر والوں کو بھی اس کھانے سے حصہ ملتا تھا اور اسی طرح جیسے تیسے اس کا گزارہ چل رہا تھا لیکن یہ۔

www.perfect24u.com

زیادہ عرصے تک قائم نہ رہا۔ سکینہ بیگم کے گھر سے کئی روز ہوئے کھانا نہیں آیا تھا۔ عبداللہ اور اس کے گھر والے تین دن بھوکے رہے۔

اس محلے میں ایک ریٹائرڈ کرنل رہتا تھا جس نے جنگوں میں حصہ لیا تھا آخری عمر میں اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا جو بھی اس کے سامنے آتا وہ ''مکھن ٹوش'' کا نعرہ لگاتا معلوم نہیں کہ ''مکھن ٹوش'' سے اس کا مقصد کیا تھا کرنل جب مر گیا تو اس کے مرنے کے بعد بھی رات کو قبرستان کے قریب بعض لوگوں نے ''مکھن ٹوش'' کا نعرہ سنا تھا اور اب یہ بات پورے محلے میں مشہور ہو گئی تھی کہ کرنل بھوت بن گیا ہے اور رات کے وقت لوگوں کو ڈراتا ہے سب لوگ ڈرے ہوئے اور رات کو بہت کم نکلتے تھے۔

توہم پرست لوگوں کی اس کمزوری سے عبداللہ نے فائدہ اُٹھانے کا منصوبہ بنالیا۔ وہ رات کو گھر سے نکلا اور قبرستان کے قریب گلی میں دیوار سے لگ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا تھوڑی دیر بعد ایک راہگیر گلی میں نمودار ہوا عبداللہ نے اس کے سامنے جا کر بڑے مہیب انداز میں ''مکھن ٹوش'' کا نعرہ لگایا راہ گیر ڈر کے مارے کا چیخنے لگا اس کے ہاتھ سے ایک بنڈل گر پڑا اور وہ سرپٹ دوڑنے لگا عبداللہ نے بنڈل اُٹھایا۔ دیکھا تو اس میں گرم روٹیاں تھیں اسی طرح عبداللہ کا یہ معمول بن گیا رات کو نکلتا لوگوں کو کرنل کے بھوت سے ڈراتا اور کچھ نہ کچھ چھین لیتا۔

ان واردات کا سن کر لوگوں نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا۔ عبداللہ کو کئی روز تک شکار نہیں ملا تو اس نے ایک اور منصوبہ بنایا جب رات کو گھر سے نکلا تو ایک گھر کے دروازے پر جا کر دستک دے دستک سن کر گھر والا دروازے کے قریب آیا اور پوچھا کون ہے عبداللہ نے کہا دروازہ کھول دو۔ آپ سے کچھ کام ہے جب دروازہ کھلا تو اس نے خوفناک انداز میں ''مکھن ٹوش'' کا نعرہ لگایا۔ گھر کے مالک نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور شور مچایا محلے کے لوگ جاگ اُٹھے اور دیواروں اور سوراخوں میں سے جھانکنے لگے گلی میں ایک آدمی کو دیکھ کر لوگوں نے دیواروں اور چھتوں پر چڑھ کر پتھر مارنے شروع کر دیئے تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ باہر نکل آئے اور عبداللہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس نے اپنا منہ کمبل میں چھپایا ہوا تھا اس نے سنگباری سے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن سنگ باری اتنی زیادہ تھی کہ عبداللہ بے حال ہو کر زمین پر گر پڑا

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

سنگ باری پھر بھی جاری رہی کچھ دیر بعد لوگ گھروں میں چلے گئے اور دروازے بند کر دیئے صبح اُٹھے باہر نکل کر دیکھا تو گلی میں کرنل کے بھوت کی لاش پڑی تھی قریب آئے تو معلوم ہوا کہ یہ تو اس محلے کا باسی عبداللہ ہے جو کرنل کا بھوت بن کر لوگوں کو لوٹتا تھا۔

......☆............☆......

محسن محلہ

(اشفاق احمد)

خلاصہ: ماسٹر الیاس ایک سیدھے سادھے آدمی تھے۔ وہ محسن محلہ میں کب آئے تھے یہ کسی کو پتہ نہیں تاہم اس کی زبان کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انبالے سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ وہ کرایے کی ایک کوٹھری میں رہتا ہے۔ محلے کے کچھ لڑکے اس کے پاس پہاڑے سیکھنے کے لیے آتے تھے۔ اس کے پاس دو بٹیر اور ایک اصیل مرغا تھا۔ جو پنجروں میں بند رہتے تھے۔ وہ تنگ دست اور بے روزگار تھا۔ شاید کہیں اور کام کرنے جاتا ہو لیکن اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ دھوکہ بازی اور ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اسے تو بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ اس کی گفتگو میں گرامر کی لاتعداد غلطیاں تھیں۔ جس سے لوگ اکثر بور ہو جاتے تھے۔ اس لئے لوگ اسے دیکھتے تو کترا کر نکل جاتے۔ وہ سوسائٹی پر بوجھ سا لگتے تھے۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ سب اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

سردیوں کو موسم میں ایک شام مالک مکان نے اسے ڈانٹا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے تین دن کے اندر پچھلے چھ ماہ کا کرایہ ایک سو اسی روپے یکمشت ادا نہ کئے تو سامان گھر سے باہر پھینک دوں گا۔ ماسٹر الیاس نے پچاس روپے دینے چاہے لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ تین دن بعد مالک مکان نے اس کا سامان باہر نکال کر گلی میں ایک ٹرانسفارمر کے نیچے بمعہ چارپائی ڈھیر کر دیا اور کوارٹر کو تالا لگا دیا۔ ماسٹر الیاس محلے کے بااثر لوگوں کے پاس گیا۔ جن میں شیخ کریم نواز وکیل صاحب اور دیگر لوگ شامل تھے۔ لیکن کسی نے ایک روپیہ قرض نہیں دیا۔ ماسٹر الیاس سخت سردی میں باہر اپنی چارپائی پر پڑے رہتے تھے۔ کھلے آسمان کے نیچے یہ اس کا آٹھواں دن تھا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ اس نے جبار حلوائی سے دوسو

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

روپے مانگے لیکن وہ یہ سن کر ہنس پڑا۔ اس کے بعد مسلسل تین روز تک ماسٹر الیاس رضائی اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھے رہے اور چوتھے روز فجر کی اذان کے وقت فوت ہو گئے۔ محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے اس کے بٹیروں اور مرغے کو دانہ ڈال دیا اور کسی نے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ شیخ کریم نواز نے دو سو روپے دیکر قبر اور کفن دفن کا بندوبست اپنے ذمے لے لیا۔ محسن محلہ کے باقی لوگوں نے آٹھ سو گیارہ روپے جمع کر کے اس کے رسم قُل کے لیئے محفوظ کر دیئے۔

......☆............☆......

کنڈکٹر

(الیاس فاطمہ)

خلاصہ: لالو کا خاندان ہمارے چھوٹے سے گھر میں مقیم تھا۔ جس کا دروازہ ہمارے صحن میں کھلتا تھا۔ وہ اپنے گھرانے کا دوسرا بیٹا تھا۔ پڑھائی میں کمزور تھا۔ وہ تتلا کر بولتا تھا۔ کاف کو ٹاف اور گاف کو ڈاف کہتا۔ ماسٹر صاحب کو اس سے ہمدردی تھی۔ جبھی تو اس کے کان نوچتے اور برا بھلا کہہ کر پڑھنے کے لیے مجبور کرتے لیکن وہ پڑھائی سے بیزار تھا۔ ہم بھی اس کو سمجھاتے۔ مو لیکن اس پر اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ اکثر کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ اکثر درخت کے سائے تلے چارپائی پر لیٹے آسمان کو دیکھا کرتا۔ چند ہفتوں سے وہ کہیں غائب ہو جاتا تھا اور گھنٹوں تک واپس نہ آتا تھا۔ ملک کی فضاؤں میں عجیب سی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد، محمد علی جناح زندہ باد کے نعرے ہر طرف سنائی دے رہی تھیں۔ یہ آوازیں ہمارے لیے نئی تھیں۔ ہم نے محرم کے جلوس اور جنازے کے جلوس کے علاوہ دیگر جلوس کہیں نہیں دیکھے تھے۔ لالو اکثر سکول سے غائب ہو جاتا اور مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کرنے پہنچ جاتا۔ ایک دن لالو اپنے بھائی کو بھی ساتھ لے گئے۔ ایک صبح گئے اور دوسری صبح تک واپس نہ آئے۔ ماسٹر صاحب انہیں ڈھونڈ کر لے ائے۔ ایک بار لیاقت علی خان کے جلوس میں ہاتھیوں پر سوار نعرے لگا رہے تھے "پاقستان زندہ باد" "جان نقل جائے پاقستان نہیں نقل سٹتا" لالو میں اہم تبدیلی آ چکی تھی۔

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

اب وہ کھل کر جلسوں میں شریک ہوتا۔ آخر کار پاکستان کی آزادی کا اعلان ہوا۔ ہم 1947ء میں پاکستان چلے آئے لیکن لالو کی کوئی خبر نہیں ملی۔

ایک دن شادی کی ایک تقریب میں شرکت کرنے ہم کراچی گئے۔ شادی کی تقریب میں شامیانے کے نیچے بچھی کرسیوں پر لڑکوں کی ایک قطار تھی۔ مجھے دیکھ کر سب کھڑے ہو گئے اور "مجھے پہچانا"، "ہمیں پہچانا" کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں لالو بھی تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بس میں کنڈکٹر ہے۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا تو وہ ہنس پڑا کہنے لگا۔ ہمارا ملک پاکستان ایک بڑی سی بس ہی تو ہے جس کو ہم چلا رہے ہیں۔ کئی سال بعد اس کی ایک اور خبر ملی کہ وہ کالج میں داخل ہو گیا ہے اور ایک سکول ٹیچر سے شادی کر لی ہے اور اب نئی خبر ملی ہے کہ اس نے اپنا گھر بھی بنا لیا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اس کا گھر تو اس وقت بن گیا تھا جب وہ چودہ اگست 1947ء کو ایک بلندی پر کھڑا نعرے لگا رہا تھا۔

☆ ☆

ایک وصیت کی تکمیل

(فرحت اللہ بیگ)

خلاصہ: میں اگرچہ مدت سے حیدر آباد میں مقیم ہوں لیکن مولوی وحیدالدین سلیم سے کبھی نہیں ملا کیونکہ انہیں ملنے سے فرصت نہ تھی اور مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ گذشتہ سال مولوی عبدالحق نے ایک جلسے میں شرکت کے لیے اورنگ آباد بلایا۔ اورنگ آباد جانے کے لیے میں سٹیشن پر ریل کے چلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک بڑے میاں ہجوم کو پھاڑتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ اس کا قد متوسط، بھاری بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، چھوٹی سی گول داڑھی، کرنجی آنکھیں، کشمیری شیروانی زیب تن اور انگریزی جراب پہنے ہوئے تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے گلے لگا لیا اور ہڈی پسلیاں ایک کر دیں۔ جان چھوٹ گئی تو پتہ چلا کہ مولوی وحیدالدین سلیم ہیں۔ بولے مجھے ڈپٹی نذیر احمد کی قسمت پر رشک آیا ہے۔ جس نے مرنے کے بعد استاد کا نام زندہ کر دیا۔ میں نے جواب دیا "بسم اللہ کیجئے، مر جایئے مضمون میں لکھ دوں گا۔" وہ خود بھی جلسے میں شریک ہونے اورنگ آباد جا رہے تھے۔ ریل کے درجہ اول میں میں مولوی صاحب اور رفیق بیگ صاحب سوار تھے۔ رفیق بیگ صاحب سو گئے اور ہم دونوں نے باتوں

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

میں صبح کر دی۔ باتوں باتوں میں مَیں نے مولوی صاحب کا خوب اندازہ لگایا۔ مولوی صاحب میں ظرافت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ وہ کسی کو برا بھلا کہتے تو ایسے الفاظ استعمال کرتے جس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ اُن کے علم زود فہمی اور طبع رسا کی تعریف سب کرتے تھے لیکن اس کے مزاج پر سب کو اعتراض تھا۔ مولوی صاحب بھلا کے کنجوس تھے، پائی پائی جوڑ کر رکھتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ غربت کا زمانہ بہت دیکھا تھا، رقم خرچ کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ آمدن زیادہ تھی اور خرچ صفر کے برابر تھا۔ لیکچر پڑھنے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ اس کے لیکچر پڑھنے میں امتیاز در ہوتا تھا جو بولنے میں ہوتا ہے۔ اورنگ آباد کے جلسے میں ایک تقریر کے دوران میں نے ایک روز مولوی کریم الدین کے پانی پت سے دہلی آنے کا حال مزاحیہ انداز میں بیان کیا۔ کریم الدین کا حال بیان کرتے وقت میرا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہو گیا۔ لوگ سمجھے کہ مولوی وحید الدین سلیم کے والد کا ذکر کر رہے ہیں کیونکہ اُن کا نام بھی مولوی کریم الدین تھا۔ مولوی صاحب دل ہی دل میں تاؤ کھاتے رہے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو لوگوں نے اسے بہت تنگ کیا، وہ مجھ سے شکایت کرنے آ پہنچے اور مجھے خوب لتاڑا۔ لیکن میں نے اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ جب بھی کوئی اس سے پوچھتا کہ پانی پت والے کریم الدین آپ کے والد ہیں تو وہ کبھی کبھی جل کر کہتے "ہاں میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے"۔ اپنے مکان میں اکیلے تھے۔ نہ بیوی نہ بچہ نہ نوکر نہ ماما۔ بان کی ایک چارپائی، دو تین ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، ذرا سی دری دو چار میلے تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی۔ یہ اُن کی کل کائنات تھی۔ سارا دن نمک کی چائے پیتے رہتے تھے۔ گھر میں کھانا نہیں پکتا تھا۔ باہر سے کھا کر آتے تھے۔ اس کی چارپائی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ اسے مٹھائی بہت پسند تھی۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتا اسی پر خط، مضمون اور غزلیں لکھتے۔ اسے نئے اصطلاحات وضع کرنے کا شوق تھا۔ انگریزی نہیں جانتے تھے مگر انگریزی اصطلاحات پر عبور حاصل تھا۔ عربی اور فارسی پر دسترس رکھتے تھے لیکن وہ اردو کے لیے بنے تھے۔

مولوی صاحب کیا مرے، زبان اردو کا ایک ستون گر گیا۔ مولوی وحید الدین جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے اس کا عشر عشیر بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔

☆ ☆

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

علامہ اقبال

(چراغ حسن حسرت)

خلاصہ: علامہ اقبال میکلوڈ روڈ پر ایک اچھی خاصی کشادہ کوٹھی میں رہتے تھے لیکن اس پرانی کوٹھی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کوٹھی کے صحن میں علامہ اقبال دھوتی باندھے ململ کا کرتہ پہنے ایک چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ سالک صاحب میرے ساتھ تھے۔ علامہ نے پہلے اس کا مزاج پوچھا پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ موضوع روکھا پھیکا تھا لیکن علامہ بیچ میں لطیفے بھی سناتے جاتے تھے۔ میں ساتویں یا آٹھویں دن علامہ کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا۔ ادب، شاعری، سیاست اور مذہب پر بحثیں ہوتی تھیں۔ اکثر علامہ بولتے تھے کیونکہ اُن کے پاس معلومات زیادہ تھیں۔ علامہ اقبال کے مکان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔ ہر مکتب فکر کے لوگ اُن سے ملنے کے لیے آتے۔ بعض لوگ بغیر کسی مقصد کے آتے تھے اور بات کئے بغیر واپس چلے جاتے تھے۔ ہر وقت لوگوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کو علامہ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ لیکن اُن سے ملنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم جیسے غریبوں کی رسائی اُن تک نہیں ہو سکتی۔ جب بعد میں ان لوگوں کو پتہ چلا کہ اُن کا گھر تو دربار خاص و عام تھا تو بہت پچھتائے۔ علامہ کی زندگی بہت سادہ تھی، کبھی فراک کوٹ کے ساتھ شلوار اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ ولایت جانے سے پہلے پنجابیوں کا عام لباس پہنتے تھے۔ کم کھاتے تھے لیکن اچھا کھاتے تھے۔ پلاؤ اور کباب اُن کی مرغوب غذا تھی۔ سردی کے موسم میں شب دیگ کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ پھلوں میں اسے آم پسند تھے۔ ٹوکریاں بھر کر کھاتے اور دوست احباب کو کھلاتے۔ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ صبح سویرے اُٹھ کے نماز پڑھتے اور تلاوت کرتے تھے۔ ورزش بہت زیادہ کرتے تھے۔ عام طور پر پنجابی زبان بولتے تھے۔ نہ کسی کو اپنا شعر سناتے تھے نہ دوسرے شعراء سے اُن کے اشعار سنتے تھے۔ یو۔ پی کے ایک شاعر نے اُن کے سامنے اپنی ایک غزل سنانی شروع کی تو علامہ بور ہو گئے۔ کہنے لگے اس قصے کو ختم کیجئے میں شعر سننے سنانے کا قائل نہیں۔ اُنہیں مشاعروں سے نفرت ہو گئی تھی۔ کہا کرتے تھے شاعری کو مشاعروں نے برباد کر دیا۔ مرحوم کی طبیعت میں ظرافت بہت

www.perfect24u.com

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

زیادہ تھی۔ خشک فلسفیانہ مسائل کو بھی لطیفوں اور پھبتیوں سے دلچسپ بناتے تھے۔ سر شہاب الدین سے متعلق علامہ اقبال کے لطیفے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال دو اشخاص کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے ملتے تھے۔ ایک مولانا گرامی اور دوسرا عبداللہ چغتائی۔ دونوں فارسی کے بڑے شاعر تھے اور علامہ کے ساتھ سچی محبت کرتے تھے۔ مولانا گرامی کے بھی بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ علامہ اقبال گھر کے اخراجات کا باقاعدہ حساب رکھتے تھے۔ اُن کی طبیعت میں بھلا کی آمد تھی۔ ایک نشست میں دو دو سو شعر لکھ جاتے تھے۔ عشقِ رسول ﷺ نے اُن کے دل کو نرم کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا نام سنتے تو آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے تھے۔

☆ ☆

اے طائر لاہوتی

(فارغ بخاری)

خلاصہ: ضیاء جعفری مرحوم کا وجود اس بوڑھے برگد کے درخت کی مانند تھا جو پشاور کے مغربی کونے میں واقع تھا۔ جہاں گرمیوں میں لوگ گرمی سے بچنے اور سردیوں میں یخ بستہ ہواؤں سے پناہ لینے کے لیے اس کے سائے میں بیٹھتے تھے۔ ضیاء صاحب کا بڑھاپا بھی اُن کے دوستوں احباب اور شاگردوں کے لیے اس بوڑھے برگد سے کم نہ تھا۔ ضیاء صاحب ہمارے پڑوسی تھے۔ میں ضیاء جعفری اور عبدالودود قمر کو بچپن سے جانتا ہوں جو سڑک پر ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ دونوں شاعر ہیں تو اُن میں میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ 1935ء میں ضیاء جعفری سے تعارف ہوا۔ ہر موضوع پر اُن کی باتیں دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتی تھیں۔

صوبہ خیبر پختونخواہ میں جدید اردو کا آغاز دائرۂ ادبیہ کے قیام سے ہوا۔ جو ضیاء جعفری اور قمر صاحب کی بے مثال دوستی کی یادگار ہے۔ ضیاء صاحب روزنامہ "انگار" کے ایڈیٹر تھے اور قمر صاحب نائب مدیر تھے۔ دونوں فارسی اور اردو زبانوں کے شاعر تھے۔ اس صوبے کے مشہور شعراء اور ادباء کی فنی تربیت میں ان دونوں کا بڑا کردار ہے۔ شاعر اور ادیب کے ساتھ ساتھ ضیاء صاحب ایک باعمل صوفی بھی تھے۔ عقیدت مندوں کا ایک ہجوم اُن کے گرد جمع رہتا تھا۔

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

دائرۂ ادبیہ کا پرانا مرکز ختم ہوا تو یار لوگوں نے میرے مکان کو اپنا حجرہ بنالیا۔ضیاء جعفری، قمر صاحب، نذیر مرزا برلاس، مرزا محمود سرحدی، مسعود انور شفقی، خاطر غزنوی، احمد فراز، محسن احسان، امیر حمزہ شنواری، جگر کاظمی، زیڈ۔اے بخاری اور شیخ ثناء اللہ جیسے نابغۂ روزگار شخصیات ربھی اپنی حاضری لگواتے تھے اور دائرۂ ادبیہ کو چار چاند لگاتے تھے۔ضیاء اور قمر صاحب کی دوستی مثالی تھی۔لیکن دونوں ایک دوسرے کے سیاسی مخالف تھے۔دونوں میں نوک جونک ہوتی رہتی تھی۔لیکن قمر صاحب اس کا احترام کرتے تھے اور خاموش ہو جاتے تھے۔قمر دائرۂ ادبیہ کے ناظم اعلیٰ اور کرتا دھرتا تھے۔سید ہونے کے ناطے وہ میرا بہت احترام کرتے تھے لیکن ذراسی غلطی اور فرو گذاشت پر بری طرح ڈانٹتے۔بیہودہ لباس پہننے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔اس کی تربیت نے مجھے چند دنوں میں لائبریرین بنا دیا۔جگر کاظمی اور خالص کی صاحب دونوں ادارہ کے سرپرست تھے اور ہر ایک سینئر شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کراچی جانا تھا میں ضیاء صاحب سے ملا جو دل کے مریض تھے لیکن اس وقت ہشاش بشاش تھے۔جب پانچ دن بعد کراچی سے لوٹا تو گھر میں بچوں نے اس کے انتقال کی خبر سنائی۔اسی طرح ادبیات ادب کا ایک رنگین باب بند ہو گیا۔

☆ ☆

مرید پور کا پیر

(پطرس بخاری)

خلاصہ: میرا تعلق مرید پور سے ہے لیکن وہاں کے لوگ مجھے نہیں جانتے کیونکہ میں ایک بڑے عرصے سے مرید پور سے باہر زندگی گزار رہا ہوں اور مرید پور کبھی نہیں گیا۔میں جس شہر میں رہتا تھا کانگریس نے وہاں جلسہ کرنے کا پروگرام بنایا۔میں اس سالانہ اجلاس میں باقاعدگی سے شرکت کرتا تھا اور اپنی روزانہ کارگزاری کی رپورٹ ایک خط کے ذریعے اپنے بھتیجے کو مرید پور بھیجا کرتا تھا۔میں اپنے بھتیجے کے نزدیک علم وفن کا ایک دیوتا ہوں۔میرا جو خط اسے ملتا وہ مقامی اخبار "مرید پور گزٹ" میں شائع کرواتا۔اسی طرح مرید پور کے لوگوں پر میری علمیت اور لیڈری کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ مجھے مرید پور کا لیڈر اور راہنما تسلیم کرنے لگے اور مطالبہ کیا کہ مرید پور آ کر ہندو مسلم اتحاد پر ایک جلسے میں خطاب

www.perfect24u.com

کردوں۔لیڈری کے شوق میں مَیں نے حامی بھرلی اور جلسے کا دن مقرر ہوا۔ میں نے اپنی تقریر کی تیاری شروع کی اور اس کی خوب مشق بہم پہنچائی اور اہم نکات ایک کاغذ پر لکھ کر جیب میں رکھ لیے۔ مقررہ دن میں مرید پور پہنچا۔ اسٹیشن پر تین ہزار کے لگ بھگ لوگوں نے میرا استقبال کیا اور نعرے لگائے۔ جلوس کی صورت میں مجھے جلسہ گاہ پہنچایا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی لوگوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اپنے لیڈر کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سب لوگ بے تاب ہو رہے تھے۔ مجھے پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور سٹیج پر ایک مخصوص نشست پر بٹھا دیا گیا۔

جلسہ شروع ہوا۔ آخر میں میرا نام پکارا گیا۔ میں بڑے طمطراق سے اُٹھا لیکن لڑکھڑایا، پھر سنبھل گیا۔ بمشکل ڈائس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لوگ مجھے دیکھتے ہی پرجوش ہو گئے۔ میں نے جیب میں اہم نکات والا کاغذ ٹٹولا۔ کاغذ غائب تھا۔ میرا گلا خشک ہو گیا، اوسان خطا ہو گئے۔ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ وہ مجھے سننے کے لیے بے تاب تھے۔ میں نے پسینہ پونچھا اور بصد مشکل کہا "میرے عزیز ہم وطنو" ذرا سا دم لے کر یہ جملہ پھر دہرا دیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں؟ آخر میرے منہ سے نکلا کہ "ہندوستان کی آب و ہوا بہت خراب ہے" یہ سن کر لوگ ہنسنے لگے۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ میں نے بیلوں کی کہانی یاد کرنے کی کوشش کی۔ لکڑہارے کے قصے پر غور کیا لیکن بات بنتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شیخ سعدی کے اشعار یاد کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ ایسے میں مجھے بیلوں کی کہانی یاد آئی اور جب میں نے کہا کہ مثلاً "تم دو بیل ہو اور جنگل میں رہتے ہو" یہ سن کر ایک طرف سے آواز آئی یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔ کسی نے سگریٹ کی خالی ڈبیہ مجھ پر پھینکی۔ پھر ایک بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ یہ حالت دیکھ کر میں سرپٹ بھاگا اور سیدھا سٹیشن جا کر ریل کے ڈبے میں گھس گیا۔

......☆............☆......

حاجی اورنگ زیب خان

(مشتاق احمد یوسفی)

خلاصہ: بشارت میرے دوست تھے۔ وہ لکڑیوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اس نے پشاور کے ایک لکڑی فروش حاجی اورنگ زیب خان سے لکڑی خریدی تھی۔ لکڑی کی مالیت سات ہزار روپے سے زیادہ

KPK MORE BOOKS, NOTES VIST NOW: PERFECT24U.COM

نہ تھی لیکن حاجی صاحب زیادہ رقم مانگتے تھے۔ کچھ عرصے اس بارے میں ان دونوں کے درمیان خط و کتابت ہوئی۔ لیکن جب نتیجہ نہ نکلا تو حاجی صاحب رقم وصول کرنے کے لیے خود کراچی تشریف لائے اور بشارت کے بن بلائے مہمان بن گئے۔ اُن کے باڈی گارڈ بھی ساتھ تھے۔ خان صاحب وجیہہ اور بھاری بھر کم آدمی تھے۔ خوبصورت اور لمبے تڑنگے تھے۔ اس کی باتوں میں وزن ہوتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد حلوہ ضرور مانگتے تھے۔ سبزی اور دال نہیں کھاتے تھے۔ اس کے لیے بلا ناغہ گوشت پکتا تھا اور خوب ڈٹ کر کھاتے تھے۔ خان صاحب بشارت کو دن میں دو تین مرتبہ یہ دھمکی ضرور دیتے کہ ''ایک پائی بھی نہیں چھوڑوں گا۔ خواہ مجھے ایک سال تک تمہارا مہمان رہنا پڑے۔'' وقتاً فوقتاً یہ بات بھی اس کی کان میں ڈالتے کہ ہمارے قبائلی علاقے میں اداب میزبانی کے دستور اور تقاضے کچھ اور ہیں۔ ہمارا دستور ہے کہ ہم اپنے عزیز مہمان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم کب جاؤ گے؟ ایسے شخص کی پختونولی مشکوک ہوتی ہے۔ دن رات مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہتی تھی۔ جس میں کام کی باتیں کم اور لطیفے زیادہ ہوتے تھے۔ قرض والی بات بھی درمیان میں آجاتی تھی لیکن خان صاحب کو قرض وصول کرنے کی جلدی نہیں تھی۔ اس معاملے کو بشارت کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا لیکن بشارت بھی آسانی سے دینے کو تیار نہ تھے کیونکہ لکڑی خراب تھی۔ اس میں گٹھل تھا اور کیڑا بھی لگا ہوا تھا۔

ایک دن صبح اُٹھتے ہی خان صاحب نے ایک تجویز پیش کی کہ اب تک جو رقم بشارت نے مجھے دی ہے اسے منہا کرنے کے بعد جو رقم واجب الادا بنتی ہے اس کے عوض بشارت اپنی بیکار اور کھٹارہ گاڑی میرے حوالے کر دے۔ بشارت نے پہلے انکار کیا لیکن طویل بحث ومباحثے کے بعد راضی ہو گئے اور سودا طے پا گیا۔ خان صاحب نے کچھ روپے نوکروں کو دیئے۔ پانچ سو روپے بشارت کی بیٹی منیزہ کی سالگرہ پر اس کو دیئے اور پشاور روانہ ہو گئے۔ خان صاحب کے جانے کے بعد بشارت کو اس کا ایک خط موصول ہوا۔ جس میں خان صاحب نے بشارت سے معذرت کی تھی اور لکھا تھا کہ ڈاکٹروں نے میری بیماری کو لاعلاج قرار دیکر خوش رہنے کی تلقین کی تھی۔ میں قرض لینے آپ کے پاس نہیں آیا تھا۔ قرض ایک بہانہ تھا میں دل بہلانے آیا تھا اور جو وقت میں نے آپ کے گھر میں گزارا۔ میری اتنی زندگی بڑھ گئی۔ میں بیماری سے ہار ماننے والا نہیں۔ یونیورسٹی روڈ پر ایک نیا مکان بنا رہا ہوں جس کے دالان میں پشاور کے پچاس یا کراچی کے سو شاعروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوگی۔ خط دیکھ کر بشارت پہلی ٹرین سے پشاور روانہ ہو گئے۔

www.perfect24u.com